شیراز فضل داد
شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ضیا جالندھری کی شاعری میں معاشرتی عناصر

Zia Jallundhri was one of the leading poets who set trends in literature and made considerable addition to the poetic tradition of Urdu. Despite strong opposition from different elements, he achieved prominent position among the literary figures of the present particularly after Independence as he took forward the artistic traditions of Urdu poetry through his graceful and versatile creativity. The author analyzes the social elements of Zia's poetry in the scenario of Independence movement in the subcontinent.

شاعری معاشرے کا آئینہ ہوتی ہے شاعر اور ادیب معاشرتی تغیرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ شاعر کا کلام اپنے عہد کی ایسی تاریخ رقم کرتا ہے جس میں نہ صرف حقائق دکھائی دیتے ہیں بلکہ اس زمانے کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے۔ اس لیے ہر دور کا ادب اس خاص عہد کا نمائندہ بھی ہوتا ہے اور آنے والے دور کا نقیب بھی۔ ایک دور میں شاعری کے متعلق یہ تصور بھی رہا کہ شاعری محض تفریح اور دل لگی کا سامان ہے۔ اُردو شاعری میں حالی، اکبر اور اقبال نے سب سے پہلے اس نظریے کی نفی کی اور شاعری میں اصلاحی مضامین، اخلاقیات اور سیاسی مسائل کو شامل کیا۔ اس طرح شاعری کا جو تصور سامنے آیا اس کے مطابق شاعری قوموں کی اخلاقی زندگی کو بہتر بنانے کا ذریعہ ہوسکتی ہے ان شعرا نے اسی مقصد کے تحت اپنے کلام سے فائدہ بھی اٹھایا۔ ترقی پسند شعراء نے بھی شاعری میں مقصدیت کو ضروری قرار دیا۔ تاہم جدید شعراء نے ان نظریات سے اختلاف کیا۔ جدید شاعروں نے نہ تو شاعری کو محض تفریح طبع کا سامان قرار دیا اور نہ ہی غافل قوم کو جگانے کا کوئی ہتھیار۔ اس حوالے سے شفقت تنویر مرزا کا کہنا ہے کہ جدید شعرا شاعری کے تفریحی پہلوؤں سے یکسر انکار نہیں کرتے لیکن انسانی زندگی پر اس کے خاموش مگر گہرے اثرات کے قائل بھی ہیں۔[1]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ضیا جالندھری اور ان کے معاصرین کے دور کو اُردو نظم کے حوالے سے پختگی کا دور کہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''اس دور کی نظمیں گزشتہ ادوار کی طرح زندگی کے کسی خاص پہلو کی ترجمانی نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو کی عکاس ہیں۔''[2] ہیئت اور معنی دونوں لحاظ سے اس دور کی شاعری میں وہ تنوع اور رنگا رنگی ہے جو اس سے پہلے نظر نہیں آتی۔ اس عہد کی شاعری کی سب سے خاص بات احساس کی فضا سازی ہے۔ یہ شاعری زندگی کے جس قدر قریب ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔

اُردو نظم نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ساتھ جنم لیا۔ یہ انقلاب برصغیر پاک و ہند کے لیے صرف سیاسی انقلاب نہیں تھا بلکہ اس خطے کی تہذیبی زندگی میں بھی ایک بہت بڑا انقلاب ثابت ہوا۔ اس کے بعد تہذیبی و ثقافتی زندگی جن رنگوں میں ڈھلتی رہی اور سیاسی زندگی میں جو نشیب و فراز آتے رہے نظم بھی برابر ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ یہ عرصہ قومی و بین الاقوامی ہر دو اعتبار سے بہت اہم

ہے۔ اس عرصے میں دو عالمی جنگیں لڑی گئیں دوسری جنگِ عظیم کے آخری سال ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے گئے۔ انسانیت کے لیے یہ بہت بڑا المیہ تھا۔ قومی سطح پر ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا، لیکن آزادی کے بعد کے مناظر بہت دلخراش تھے لوگوں نے صدیوں کے رکھ رکھاؤ اور تہذیبی مفاہمت کو بالائے طاق رکھ کر وسیع پیمانے پر بربریت کا مظاہرہ کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ عام لوگوں کے زخم تو مندمل ہو گئے لیکن معاشرے کے حساس طبقے کے لیے ان تجربات کو فراموش کرنا ناممکن تھا۔ آزادی کے بعد ملک میں خودغرضی، اقربا پروری، رشوت ستانی اور دھاندلی جیسی برائیاں معاشرے میں عام ہو گئیں۔ زباں بندی اور آمریت کی فضا نے شاعروں اور ادیبوں کی سوچ کو نیا رُخ دے دیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۴۱ء کے بعد اُردو شاعری خصوصاً نظم میں بتدریج غم اور افسردگی کی فضا پیدا ہوتی چلی گئی۔ [۳] دوسری جنگِ عظیم کے بعد افریقہ اور ایشیا کے کئی ممالک میں آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں ان میں سے کئی ایک تحریکیں کامیاب بھی ہوئیں ان سے ایک تصور یہ پیدا ہوا کہ آزادی کے بعد بہت خوشگوار زندگی کا آغاز ہو گا، جبر و استحصال کا خاتمہ ہو گا، جمہوری اقدار کو فروغ ملنے کے باعث عام آدمی کو زندگی کے بنیادی حقوق حاصل ہوں گے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ آج بھی ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک میں بھوک، غربت، بیماری، جہالت اور بیروزگاری جیسے مسائل ہر طرف نظر آتے ہیں۔ ان حالات نے شاعری اور ادب کو ایک نئی جہت سے روشناس کیا۔ ادیبوں اور شاعروں نے علامات کے پردے میں حقائق کو بیان کرنا شروع کر دیا۔

ضیا جالندھری کا تعلق جس عہد سے ہے اس عہد کی معاشرتی، سیاسی اور سماجی زندگی کے خدوخال یہی ہیں۔ ضیا جالندھری متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اپنی محنت اور ہمت سے آگے بڑھے لہذا اپنے اس سفر کے دوران معاشرتی زندگی کی ہر سطح کو بہت قریب سے دیکھا، ہر طرح کے ماحول اور حالات کو دیکھنے اور سمجھنے کے ان کو کئی مواقع ملے۔ بچپن میں اپنے والد کی ملازمت اور بعد ازاں اپنی ملازمت کے باعث کئی شہروں اور ملکوں کا سفر کیا اور معاشرتی تنوعات کا مشاہدہ کیا۔

ضیا جالندھری کا شعری سفر تقریباً سات دہائیوں پر مشتمل ہے۔ آپ پانچ شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ ''سرِ شام'' ضیا جالندھری کا پہلا شعری مجموعہ ہے ۔ اس مجموعے میں نو غزلیں، چھ گیت اور تیس نظمیں شامل ہیں۔ زمستاں کی شام اور ساحلی طویل نظمیں ہیں جو موضوع اور اظہار دونوں کے اعتبار سے سرِ شام کی دیگر نظموں سے مختلف ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ منظوم ہے۔

ضیا جالندھری کا دوسرا شعری مجموعہ نارسا ہے۔ اس میں کل انتیس تخلیقات شامل ہیں۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۶۸ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کا سرورق عبد الرحمٰن چغتائی نے تخلیق کیا تھا اور خطاطی عبد الرشید بٹ نے کی تھی۔ نارسا کے سرورق کے حوالے سے نظیر صدیقی کہتے ہیں کہ اس کتاب کا مطالعہ پہلی نظم سے نہیں بلکہ اس کے سرورق سے شروع کرنا چاہیے۔ سرِ ورق پر ایک عقاب کی تصویر ہے جس کے پروں پر شاعر کا نام تحریر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ایک عقاب ہیں۔ عقاب ایک تیز ترین پرندہ ہے جو بلند پرواز بھی ہے اس کے باوجود ایک دیوار کو عبور نہیں کر پا رہا۔ شاعر کی حیثیت سے ان کے لیے یہ دیوار مکمل اظہار ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے اظہار میں تشنگی ہے اور اسے وہ نارسائی کا نام دیتے ہیں۔

اور پھر لفظ کہ رہتے ہیں گریزاں خود سے
کون سنتا ہے انہیں؟ کون سمجھتا ہے انہیں
جانے کیا بات تھی کیا تو نے سنی
اپنے اظہار پہ نادم تھا پشیمان تھا میں (کلیاتِ ضیا،ص ۲۱۸)

ضیا جالندھری کا تیسرا مجموعہ خواب سراب کے نام سے منظرِ عام پر آیا اس میں شامل تخلیقات کی تعداد ستائیس ہے۔ بگولے کے عنوان سے ایک طویل نظم شامل ہے۔ یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۹۸۵ء میں مطبوعاتِ حرمت کے تحت شائع ہوا۔ اس کا سرورق صادقین کا بنایا ہوا ہے۔

خواب سراب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ٹوٹتے بکھرتے خوابوں کی دکھ بھری داستان ہے یہ مجموعہ شاعر کی سیاسی بصیرت کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

پسِ حرف ضیا جالندھری کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے یہ مجموعہ الگ کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۳ء میں ''سرِ شام سے پسِ حرف تک'' میں شامل ہوا اور دوسری مرتبہ ''کلیاتِ ضیا'' میں شامل ہوا۔ اس کا سرورق صہیب القائی نے تخلیق کیا۔

ضیا جالندھری کا پانچواں مجموعہ ''دمِ صبح'' ہے۔ یہ ۲۰۰۲ء میں لاہور سے شائع ہوا۔اس مجموعے کا جوسرورق ''کلیاتِ ضیا'' میں شامل ہے وہ ضیا جالندھری کی نواسی علینہ پیرزادہ کا بنایا ہوا ہے۔

موضوعات کے اعتبار سے دمِ صبح پہلے چار مجموعوں سے مختلف ہے لیکن خیالات کا تسلسل اور بہاؤ موجود ہے۔ شاعر کی فکر نے سرِ شام سے جس سفر کا آغاز کیا تھا چاروں مجموعوں میں اس کے دھارے مختلف سمتوں میں پھیلتے گئے اور بالآخر ''دمِ صبح'' تک آ کر فکر کے تمام دھارے ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔

ضیا جالندھری نے اپنی نظموں میں ذات و کائنات کی بے معنویت میں بھی معنی تلاش کیے اور اپنے معمول کے گردوپیش میں زندگی کا کھوج لگایا۔ ان کا تعلق جس گروہ سے تھا وہ ہیت تو مغرب سے لے سکتے تھے لیکن لفظ کا مرحلہ کٹھن اور دشوار تھا۔ جمیلہ شاہین لکھتی ہیں۔''ضیا جالندھری کے نزدیک شاعر کا منصب صرف یہ نہیں کہ وہ سکوتِ ذات اور سکوتِ کائنات کو، خلفشارِ باطن اور انتشارِ ظاہر کو فوٹو گرافر کی طرح کیمرے کی آنکھ سے دیکھتا رہے اس لیے انہوں نے اپنی نظموں میں ذات و کائنات کے بے معنی پن میں بھی ایک معنی تلاش کیے اور اس آگہی کی بدولت ان کے ہاں لفظ کا جھوٹا ثبات نہیں۔ بے کار سے بے کار اور لغو گردوپیش میں بھی زندگی گزارنے کی صلیب اٹھا لینے کے اس عزم نے ضیا کی شاعری کے ہر لفظ کو سہہ جہتی انداز دیا ہے۔''[۴]

ضیا جالندھری نے جب شاعری کا آغاز کیا تو حلقے کے شاعر ہیت اور موضوعات میں نت نئے تجربے کر رہے تھے۔ شاعری کو آزاد اور معریٰ نظم سے متعارف کروایا جا رہا تھا۔ بڑھتے ہوئے سماجی اور اجتماعی شعور، مغربی علم اور وسیع مطالعے نے تاریخ، تمدن، فلسفہ، سیاست، اقتصادیات اور نفسیات کے متعلق حقائق کو شعر کا موضوع بنا دیا۔ لیکن اس انداز سے کہ شعر و فن کی جمالیاتی قدریں محفوظ رہیں۔

الطاف گوہر لکھتے ہیں کہ ضیا جالندھری محض فیشن کے طور پر یا قافیہ ردیف کی پابندیوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے آزادنظم کی طرف نہیں آئے بلکہ ان کی کئی نظموں میں بیک وقت تین تین قافیوں کی پابندی کی گئی ہے۔ [۵]

نئی راہیں تلاش کرنے کی ضرورت صرف اس لیے محسوس ہوئی کہ الفاظ اور ہیت پر معنی قربان نہ ہو جائیں۔

ضیا جالندھری گردوپیش کے حالات سے پوری طرح باخبر رہتے ہیں اور ان حالات سے پیدا ہونے والے کرب اور اذیت سے گزر کر اس دکھ کا تجربہ کرتے ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں۔''ضیا جالندھری کی شاعری میں گردوپیش کے حالات کے متعلق احتجاج اور بغاوت کی بلند بانگ لے مفقود ہے۔ وہ براہِ راست بیانیہ انداز میں سیاسی نعرہ بازی سے بھی اجتناب کرتے ہیں مگر انفرادی اور اجتماعی فکر وعمل پر سیاسی تبدیلیوں کے اثرات کو اپنے مخصوص رمزیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔'' [۶]

حصولِ آزادی کے بعد ہر محبّ وطن پاکستانی کی طرح گہرے کرب سے گزرنا پڑا اور انہیں یہ محسوس ہوا کہ یہ وہ صبح نہیں جس کے حسین سپنے انہوں نے اپنی آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ تقسیم کے دوران اور بعد کے فسادات شاعر کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے۔ فسادات کا نہ تھمنے والا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ تعصب اور نفرت کی ایسی آندھیاں چل رہی تھیں جن سے مشترکہ تہذیب و ثقافت کا ڈھانچہ ہل کر رہ گیا تھا۔ اس طوفان کی لپیٹ میں مذہب، زبان، کلچر اور دوسرے سماجی ادارے بھی آ گئے۔ معاشی مسائل، سماجی ناہمواری، اقرباپروری اور اخلاقی قدروں کی پامالی پر ضیا جالندھری اپنے دکھ کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

کِسے یقین تھا کہ پلٹے گی رات کی کایا
کٹی تو رات مگر ایک ایک پل گن گن
افق پہ آئی بھی تھی سرخیِ سحر لیکن
سحر کے ساتھ ہی ابرِ سیاہ بھی آیا
سحر کے ساتھ ہی حدِ نگاہ تک چھایا
یہ کیا غضب ہے کہ اب تیرہ تر ہے رات سے دن
زمانہ، شوخ شعاعو اداس ہے تم بن (کلیاتِ ضیا،ص۹۳)

ضیا جالندھری کا کہنا ہے کہ آج کے انسان کی زندگی اخلاقی قدروں سے دوری کی بنا پر رنگوں اور روشنیوں سے مزین ہونے کے باوجود حقیقی لذت سے محروم ہے۔ پرانی اقدار نئے دور کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ نئی نسل ایک ایسے دور اہے پر کھڑی ہے جہاں ایک طرف وہ تہذیب ہے جو مٹ رہی ہے اور دوسری طرف وہ تہذیب ہے جس کو ابھی فروغ پانا ہے۔ جدید شعرا کے کلام میں موت اور فنا کا خوف، تنہائی، مایوسی، بے زاری، نامرادی اور بے بسی کا احساس اسی شکست و ریخت کے ردّعمل کا نتیجہ ہے۔ ہر سمت کشمکش اور تضاد کی وجہ سے انسان کی ذات کئی خانوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور اس کو اپنی ذات پر بھروسہ اور اعتماد باقی نہیں رہا۔

ضیا اپنی تباہی پر انہیں بھی ناز تھے کیا کیا
ہمیں دیکھا تو صحراؤں، بیابانوں کے دل ٹوٹے (کلیاتِ ضیا،ص۷۵)

ضیا جالندھری نے اقتصادی نا ہمواری اور معاشی عدم مساوات کے باعث معاشرے میں دندناتی افلاس، بھوک اور بیماری کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ سامی اس حوالے سے ایک اہم نظم ہے۔ سامی کا نام آتے ہی ذہن میں تپ دق کا مرض آجاتا ہے۔ سامی سینیٹوریم میں ٹی بی کے مریضوں کو رکھا جاتا ہے لیکن غربت و افلاس کے ہاتھوں ٹی بی کا شکار ہونے والے مریض اس صحت افزا مقام پر بھی صحت یاب نہیں ہو پاتے اور وہیں خون تھوکتے تھوکتے مر جاتے ہیں۔ پسماندہ اور غریب ملکوں میں آج بھی اس مرض کو موت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے پس منظر کے حوالے سے یہ مرض اور بھی ہولناک ہے کیوں کہ بانیِ پاکستان کی موت کا سبب بھی یہی مرض بنا۔ بھوک، غربت اور بیماری چہروں کی رونق چھین لیتی ہے۔

گلال چہرے اتر گئے ہیں
یہ گھر مریضوں سے بھر گئے ہیں
جو کل تھے شیر آج مر گئے ہیں
یہ جانے والے کدھر گئے ہیں (کلیاتِ ضیا،ص۱۲۸)

ضیا جالندھری کی شاعری میں برف زار جا بجا نظر آتا ہے۔ برف اور ٹھنڈک ان کے یہاں معاشرے کی بے حسی ، جدید عہد کی میکانکی زندگی، اندازِ فکر اور کھوکھلے پن کی علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا یہ برف زار ضیا جالندھری کا جہنم ہے۔ ضیا کا برف زار ایلیٹ کے ویسٹ لینڈ اس سے اس اعتبار سے مشابہ ہے کہ دونوں میں زندگی موت کی زد میں آچکی ہے۔[۷]

جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام نے معاشی سطح پر نچلے طبقے کا نہ صرف استحصال کیا ہے بلکہ معاشی عدم استحکام اور طبقاتی کشمکش کو بھی پروان چڑھایا ہے۔ عام آدمی احساسِ محرومی اور شکست خوردگی کے احساس سے زندگی کا حسن کھو بیٹھا اور اس کے لیے زندگی ویرانیوں کا نمونہ بن گئی۔ عام آدمی معاشرے میں جس حیثیت سے بھی موجود ہوتا ہے۔ جبر اور استحصال کا شکار ضرور ہوتا ہے چاہے وہ کلرک ہو، ٹائپسٹ ہو یا کوئی گھریلو ملازم یا ملازمہ ان کے لیے زندگی روزی کمانے کے چکر کے علاوہ کچھ نہیں۔ نہ وہ خواب دیکھتے ہیں اور نہ ہی خواہشیں اور آرزوئیں پالتے ہیں۔ وہ زندگی کے محور کے گرد ایک میکانکی انداز سے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ نظم ٹائپسٹ میں ٹائپسٹ کی مشینی زندگی کے بارے میں کہتے ہیں۔

پاس ہی پیڑ پہ ہُد ہُد کی کھٹا کھٹ کھٹ کھٹ
اور نڈھال انگلیاں کہتی ہیں تھکا تھک تھک تھک
محض ابجد کی بدلتی ہوئی بے حس ترتیب
لفظ ہی لفظ پہ احساس نہ ارماں کوئی (کلیاتِ ضیا،ص۱۵۰)

ضیا جالندھری کسی سیاسی تحریک سے کبھی وابستہ نہیں رہے اور نہ ہی سیاست سے متعلق ان کے کوئی مخصوص نظریات تھے لیکن انہوں نے اپنی نظموں میں پاکستان کی سیاسی اور معاشی تاریخ بھرپور فنکارانہ مہارت سے پیش کی ہے۔ اختر عثمان ضیا جالندھری کی

ایک نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔''کسی شاعر کے غیر سیاسی ہونے کا مفہوم ہرگز یہ نہیں کہ وہ قومی و عالمی صورتِ حال سے بالکل بے خبر اور لاتعلق رہے اور اپنی خیالی دنیا میں کھویا رہے۔ شاعر اور ادیب اقدار اور روایتوں کو جنم بھی دیتے ہیں اور سماجی اقدار کو تنقید کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔ [۸] معزول، تیرگی، راہیں، ناپائیدار، پیغام، سرخ ہوا، بگولے، بے مہار اور کئی دیگر نظمیں سیاسی موضوعات کی حامل ہیں۔

جب ہوا بدلتی ہے
اور معتدل موسم
تند و تیز طوفاں کی
زد پہ آنے لگتے ہیں
تو کلاہِ کج والے
مہر و مہ کی دھج والے
یوں لرزنے لگتے ہیں
جیسے ان کی نظروں میں
آنے والا ہر لمحہ
لطمہ زمانہ ہو
ضربِ تازیانہ ہو (کلیاتِ ضیا،ص۲۵۹)

ضیا جالندھری کا کہنا ہے کہ دنیا ایک بساط ہے اور انسان شاطر زمانے کے ہاتھ میں بے بس مہرہ ہے جو ان دیکھے ہاتھوں کے اشاروں پہ چلتا جا رہا ہے۔ انسان اپنی تخلیق اور پیدائش کے عمل پر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ وہ انتخاب نہیں کر سکتا کہ کہاں؟ کب؟ اور کس حیثیت کے لوگوں میں پیدا ہو اور جب اس کے پاس اس بات کا اختیار نہیں ہے تو پھر طبقاتی اونچ نیچ اور ذات پات کی بنا پر انسانوں میں تفریق بھی ہونی چاہیے۔ انسان تمام عمر اس بات کی سزا پاتا ہے جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ وہ تقدیر کے ہاتھ میں ایک مہرہ ہے۔ غالب نے مجبوروں پر مختاری کی جس تہمت کی طرف اشارہ کیا تھا اسے ضیا جالندھری نے یوں کہا ہے۔

شکست و تعمیر کے تسلسل میں تو ہے، میں ہوں
ہم ایسے مہرے
جنھیں ارادے دیے گئے ہیں
پہ جن کی توفیق پر حدیں ہیں (کلیاتِ ضیا،ص۳۰۴)

دولت اور اقتدار کے لیے جنگ کسی ایک ملک یا خطے کا مسئلہ نہیں ہے یہ ساری دنیا کا المیہ ہے۔ خوں ریزی اور تباہی پھیلانا

انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ ضیا جالندھری نے جنگ اور جبر کو کئی نظموں کا موضوع بنایا۔ نظم 'عرض داشت' میں انہوں نے انسان کی وحشت کی انتہائی شکل یعنی ایٹمی جنگ کی بات کی ہے۔ یہ ایٹمی حملہ پوری انسانیت کے لیے انتہائی شرمناک واقع تھا۔ شیطان بھی انسان کی اس شیطانی حرکت پر خاموش نہ رہ سکا اور فوراً خدا کے حضور جا کر اس دن کی یاد دلائی جب فرشتوں نے انسان کے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا۔ ابلیس انسان کی اس حرکت پر اس کو اپنا استاد کہتا ہے۔

میں تو بدنام ترغیب تھا ہی مگر
اس کی ہر طرزِ ایجاد میرے لیے درسِ استاد تھی
خیر کے نام پر
قتلِ انصاف و خونِ عبث
زور زر کی ہوس
دِل کی پُر فن سیاہی
جنگ، وحشت، تباہی (کلیاتِ ضیا، ص۳۴۸)

ضیا جالندھری نے سماجی قدروں کو بھولے بسرے خواب کہا ہے اور وہ لوگ جو ان اقدار کی پاسداری کرتے ہیں وہ خودغرض معاشرے میں ایسے ہی ہیں جیسے کسی گئی رُت کے پھولوں کی دکان۔ ضیا جالندھری جانتے تھے کہ وہ جس معاشرے میں رہ رہے ہیں وہاں ظلم، جبر، ناانصافی، حق دار کی حق تلفی عام روایت بن چکی ہے۔ وہ اقدار اور معیار جو انسانیت کی معراج سمجھے جاتے تھے آج انہیں قدروں کو پامال کرنا قابلِ فخر کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم نے معاشرے کا سکھ چین چھین لیا ہے۔ اس کے باوجود ضیا جالندھری نے امید کی جوت جلائے رکھی۔ ماضی اور ماضی سے وابستہ تمام حوالے ان کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

ضیا جالندھری نے دومختلف نظموں میں اپنی شفیق ماں اور سخت گیر لیکن سائبان جیسے والد کے کردار کو بھی پیش کیا ہے۔ پوری قوم کو سائبان مہیا کرنے والے قائد کا ذکر بھی بہت عقیدت اور محبت سے کیا ہے۔ لاہور شہر سے اپنے جذباتی لگاؤ کا بھی اظہار کیا ہے۔ ضیا جالندھری کا خیال ہے کہ رشتے اور ماضی کے حوالے انسان کے لیے طمانیت کا باعث ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی کشمکش اور کسک کا باعث بھی بنتے ہیں۔

ضیا جالندھری نے عہدِ جدید کے انسان اور اس کے مسائل کو بہت اچھی طرح سمجھا ہے وہ اس کی الجھنوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔

تجھے ہے آرزوئے یک دِلی ضیا لیکن
ہمارے عہد کا انسان انتشار میں ہے (کلیاتِ ضیا، ص۴۸۴)

حوالہ جات

۱۔ شفقت تنویر مرزا، ''ضیا جالندھری کی شاعری'' مشمولہ مہر نیم روز کراچی جنوری ۱۹۵۷ء، ص ۲۰
۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ''نیا پرانا ادب''، لاہور الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱۳

۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، 'اُردو شاعری کی مزاج''، لاہور مجلسِ ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۳۶۵، ۳۶۶)

۴۔ جمیلہ شاہین، ''لفظ کہ اظہار میں'' مشمولہ فنون لاہور

۵۔ امجد الطاف، تبصرہ سرِ شام غیر مطبوعہ مضمون ۲۲ فروری ۱۹۵۵ء ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوا۔

۶۔ فتح محمد ملک، پروفیسر ''ضیا جالندھری کے خواب (۱)''، مشمولہ تعصّبات لاہور سنگِ میل ۱۹۹۱ء، ص ۳۲۱

۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''ضیا جالندھری کی نظمیں'' مشمولہ تنقید اور احتساب لاہور ۱۹۶۸ء

۸۔ اختر عثمان، 'غیر مطبوعہ مضمون، ضیا جالندھری کی سالگرہ کے موقع پر حلقہ اربابِ ذوق کی تقریب میں پڑھا گیا۔